

فورٹ ولیم کالج

سجاد احمد سلطان

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی اغراض کے لئے وارد ہندوستان ہوئی اور موقعہ پا کر حکومت پر قابض ہو گئی۔ حکومت کا نظم و نسق احسن طریقے سے چلانے کے لئے انہیں ہندوستانیوں کی تہذیب، کلچر اور خاص کر زبان سمجھنے کے لئے فورٹ ولیم کالج جیسے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی، جو ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں ہنگامی بنیادوں پر انتظامی امور کو انجام دینے کی غرض سے قائم کیا گیا۔ اس کالج کے قیام سے قبل اردو میں نثری سرمایہ کا فقدان پایا جاتا تھا اور اگر کہیں نثری نمونے ملتے تھے، اُن کی زبان بہت حد تک اور فارسی آمیز تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت تک فارسی علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے زبان زد عام تھی اور فارسی آمیز لہجہ کے اعتبار سے مقفی و مسجع ہوا کرتی تھی۔ جس کا فہم و ادراک نووارد انگریز عہدہ داران کے لئے بہت ادق تھیں۔ اسی طرح سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔ جس کے لئے ملک کے گوشے گوشے سے ادیبوں اور انشا پردازوں کو جمع کیا گیا۔ اور اُن سے بجائے رطیح زاد لکھوانے کے اُس زمانے میں موجودہ فارسی کتابوں، داستانوں کا ترجمہ کرنے کے لیے تاکید کیا گیا کیونکہ کو نصاب کتب کی تیاری میں عجلت درپیش تھی۔ اس لئے ان ادیبوں سے داستانوں کا سیدھا، سادھا، سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کرانے پر زور دیا گیا۔ دراصل فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز عہدہ داروں کو اردو سکھانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبدالطیف نے ”ارباب نثر اردو“ کے پیش لفظ میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

”ایسٹ انڈیا کمپنی“ نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ مذاکتوں اور لفظی موشگامیوں کے بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لیے ان مصنفوں سے بجائے مشکل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور، متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔“

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں۔ اردو میں مبتدیوں کے پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس زبان میں، مقفی و مسجع سے پاک و صاف

نے انجام دیا۔ گلکرسٹ کے کارناموں پر تفصیل ڈالنے سے قبل اس کالج کے بارے میں چند انکشافات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ حالانکہ کالج کا باضابطہ طور پر قیام ضوا بطوں کے تحت ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء میں لایا گیا لیکن انہیں ٹیپو سلطان کی شہادت کا ایک سالہ جشن منانا تھا تو انہوں نے ۱۰ کے بدلے میں ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی۔ دوسری بات یہ کالج کسی قلعے پر قائم کیا گیا، بلکہ کلکتہ شہر کے مرکز میں ایک سرکاری عمارت میں ۴ فروری ۱۸۰۱ء سے باضابطہ طور پر کام کرتا شروع کیا۔ اس کے لئے کبھی بھی کوئی عمارت تعمیر نہیں کی گئی، جس جگہ پر اس نے اپنا کام کرنا شروع کیا تھا اُس جگہ کو آج (writers buildings) کہتے تھے۔ آج اس جگہ ایک شاندار بلڈنگ بنی ہے جو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ کا دفتر ہوتا ہے۔ نہ یہ دریا ئے یلگی کے کنارے تعمیر کیا گیا بلکہ شہر کلکتہ میں ہی قائم ہوا تھا جہاں کالج کبھی تھا ہی نہیں۔ پرنسپل لے لئے پرووسٹ اور وائس پرنسپل کے لیے نائب پرووسٹ، بڑے پوسٹ پادریوں کو ہی دئے جاتے تھے۔ دیسی لوگوں کو منشی وغیرہ کا نام دے دیا گیا۔ یہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی قرار پائی۔ عتیق احمد صدیقی کے مطابق کالج کا پہلا پرنسپل پادری ریونڈر براؤن تھا۔ ان باتوں سے قطع نظر فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنفین اور ان کے کارناموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ: Dr. John Barth Wick Gilchrist (1759-1841) اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ علم طب حاصل کر لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات ہوا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے فارسی اور اردو زبان میں دلچسپی لینی شروع کی اور ایسا یار اور ہونے کے لئے انہوں نے ہندوستانی وضع قطع اپنایا اور اردو زبان کے مراکز دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر فارسی اور اردو سیکھی۔ انہوں نے کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی زبان دفتری زبان بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اردو کو دفتری زبان مفید ہوگا۔ بعد میں ۱۸۳۲ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ گلکرسٹ تقریباً ۳۰ سال تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ انہوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں۔

انگریز ہندوستانی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو کی صرف و نحو، مشرقی زبان داں، اردو زبان پر مختصر مقدمہ، ہندی کی آسان مشقیں، فارسی افعال نظریہ، اجنبیوں کے لئے رہنمائے اردو، بیاض ہندی، علمی خاکے، ہندی الفاظ کی قرأت، اتالیق ہندی، ہندی عربی آئینہ، مکالمات انگریز و ہندوستانی، مشرقی قصے اور داستان گو۔

میرامن دہلوی:۔ ان کا اصلی نام میرامان تھا۔ امن تخلص تھا۔ دہلی میں ان کی ولادت ہوئی۔ تیس سال تک دہلی میں قیام پزیر رہے۔ احمد شاہ درانی کے حملے میں ان کا گھر بار لٹ گیا اور سورمل جاٹ نے ان کی جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ شکست حال پٹنہ تشریف لے گئے اور چند سال مصیبتوں میں گزار کر اپنے اہل و عیال کو وہیں چھوڑ کر کلکتہ آگئے میر بہادر علی حسینی کے توسط سے جان گلکرسٹ تک رسائی یقینی بن گئی۔ جس نے ان کی علمیت سے متاثر ہو کر فورٹ ولیم کالج میں بطور منشی ملازمت دے دی۔

جہاں انہوں نے ”باغ و بہار“ اور گنج خوبی“ لکھی۔ ”باغ و بہار“ حقیقت میں میر محمد حسین عطا خان تحسین کی نو طرز مرصع ہے جس سے گلکرسٹ کی فرمائش سادہ اور عام بول حال کی زمان میں میرامن نے ۱۸۰۲ء میں لکھا۔ داستانی ادب میں جن

خوبیوں اور خامیوں سے عبارت ہے وہ سبھی باغ و بہار میں پائی جاتی ہے۔ اس داستان کو لافانی اور شاہکار بتانے والی شے ان کا اسلوب ہے۔ میرامن کو دہلی زبان پر عبور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روزانہ بول چال میں قصے کو پیش کیا ہے۔ اس کا انداز بیان بہت سادہ دلکش اور موثر ہے اور یہی اس داستان کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ یہ اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے اردو نثر کی پہلی زندہ کتاب گرداں ہے۔

سید حیدر بخش حیدری: میرامن کے بعد فورٹ ولیم کالج میں انہیں کافی شہرت نصیب ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج میں انہیں ملازمت ملی تو انہوں نے گل کرسٹ کو اپنی کتاب ”قصہ مہر و ماہ“ کو پیش کیا۔ جو انہیں بے حد پسند آئی۔ بعد میں انہوں نے قصہ لیلیٰ مجنون (امیر خسرو کی مثنوی کا نثری ترجمہ) طوطی کہانی جو سنسکرت زبان کی ”شک سپتتی“ پر مبنی ہے۔ جس کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں، ان کی تیسری کتاب ”آرائش محفل“ یعنی قصہ حاتم طائی کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔

اسکے علاوہ میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کے علاوہ بھی کئی مشہور و معروف ادبا فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے اور تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کام میں مصروف رہے۔ ان میں مولوی امانت اللہ، مظہر علی خان، مرزا جان پیش، میر کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین، خلیل خان اشک، مولوی اکرم علی، نہال چند لاہوری، منشی بنی نارائن جہاں وغیرہ وغیرہ۔

علی گڑھ تحریک

سجاد احمد سلطان

علی گڑھ تحریک مسلمان قوم کے محسن اور اردو ادب کے میجا سرسید احمد خان کی انتھک کوشش اور بے مثال قربانی سے وجود میں آئی۔ اس تحریک نے ایک شکست خوردہ قوم کو تباہی و بربادی کے دلدل سے نکال کر اس کا کھویا ہوا وقار بہت حد تک بحال کر دیا۔ سرسید بیک وقت مصلح، مفکر، ماہر تعلیم، صحافی اور صاحبِ اسلوب تھے۔

علی گڑھ تحریک کا آغاز ۱۸۵۷ء کے غدر اور اس کے غضبناک حالات سے ہوا۔ غدر کے حالات نے سرسید کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ انگریز حاکموں کے ہاتھوں ملک اور قوم کی جو بربادی ہوئی اس سے سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ غدر کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں ایک خلیج پیدا ہوئی۔ انگریزوں کے دل میں یہ بات گھر کر گئی اس غدر کی لڑائی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا عمل دخل رہا۔ اُدھر مسلمان بھی انگریزوں سے نفرت کرنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے انگریزوں کی ہر چیز سے بایکاٹ کیا، حتیٰ کہ ان کی زبان سیکھنے سے بھی نفرت کرنے لگے۔ سرسید ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر دل ہی دل میں غور و فکر کر کے تدبیریں ڈھونڈنے لگے۔ انہوں نے اپنی قوم کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے یہ جذبہ اُجاگر کیا اور اُن کو اس بات کے لئے راضی کیا کہ مسلمان جدید علوم، صنعت و حرفت، ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کئے بغیر ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ اس لئے سرسید نے ایک انجمن سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی اعلیٰ علمی، تہذیبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے اور ان لوگوں کو اس سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے۔ جو براہ راست انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس کی بنیاد لارڈ لٹن کے ہاتھوں ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ یہی سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ مانا جاتا ہے جو آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہاں کی یونیورسٹی کو دیکھا جس سے ان کا منزل مقصود روشن ہوا۔ ذہنوں کو بدلنے کے لئے انہوں نے اپنا رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ نکالا۔ اسلام کی تشریح عقل کی روشنی میں کی اور جدید سائنس کو سامنے رکھ کر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سرسید ”تہذیب الاخلاق“ سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل دو اخبار ”اسپیکٹر اور ٹیٹلر“ نکال کر انجام دے رہے تھے۔ اس ”تہذیب الاخلاق“ مقالہ نگاروں میں سرسید کے بہت قریبی ساتھی بھی شامل تھے۔ اس رسالے کے اجراء کا مقصد خود سرسید کی قربانی پیش ہے۔

”ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے

تہذیب الاخلاق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ اجتہاد ہر دور میں فرض ہے۔ اس نے مسلمانوں کو مذہبی و سماجی رجعت پسندی کے غار سے باہر آنے کی دعوت دی۔ اس اخبار کے خلاف بہت سے اخبار نکالے گئے۔ اس کی مخالفت مسلمان اخبار نے کی جو سرسید کی مخالفت کے کسی موقعے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے مثال کے طور پر مولوی امداد علی نے تہذیب الاخلاق کے طرز پر ایک رسالہ ”امداد الآفاق“ اس رسالے کی تردید میں مولوی علی بخش خان بہادر نے شہابِ ثاقب اور تائید الاسلام نکالے۔ دہلی کے اکمل الاخبار کو بھی سرسید کے مخالف اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سرسید نے اردو میں جس آسان، سادہ اور علمی نثر کا آغاز کیا وہ بہت کچھ انہی کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے اردو نثر کو سنوارا اور پختہ رنگ و روپ بخش کر علمی معیار عطا کیا۔ سرسید سے مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری کا اردو ادب میں آغاز ہو گیا۔ بقول آل احمد سرور: سرسید اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ جس نے ہر طرح کے مضامین لکھے۔ سرسید کی نثر کا اس حد تک اثر تھا کہ ان کے مخالفین بھی انہی کی تحریر میں جواب دینے کی کوشش کرتے جس سے سرسید کی نثر کو اور پھلنے پھولنے کے سنہری مواقعے میسر ہوئے۔ ان کے رفیقوں میں نواب محسن الملک، حالی، آزاد وغیرہ نے ایسے مضامین لکھے جن میں انشائیہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ سرسید کا ایک بڑا کارنامہ کہ انہوں نے اردو نثر کو بوجھل پن سے پاک کیا۔ رنگین عبارت آرائی کی جگہ سادگی اور اختصار نے لے لی اور نثر نگاری کا رواج عام ہوا۔ سرسید تحریک کی بدولت خالص ادبی سطح پر اردو میں تنقید نگاری، سیرت نگاری، تاریخ نگاری، ناول نگاری، سوانح نگاری وغیرہ کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ ان اصناف نے کئی ابتدائی مراحل اُس دور میں طے کئے۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اردو نثر میں نئی جان ڈالنے والا یہ محسن ۱۸۹۸ء میں ابدی نیند سو گیا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو صحافت

سجاد احمد سلطان

صحافت ایک معتبر پیشہ ہے۔ اخبار نویسی، صحیفہ نگاری یا جرنلزم کے دیگر ناموں سے بھی مشہور ہے۔ صحافت نگار، صحافی، اخبار نویس یا جرنلسٹ کہلاتا ہے۔ کچھ صحافی اس مقدس پیشہ کو ایک نیک عمل مان کر عوام کی صحیح ترجمانی کر کے اس سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور گونا گوں مسائل کی تہہ تک جھانک کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس سے اپنے دلی تسکین اور شہرت کے باعث اپنا کر اس کے ساتھ حقیقی معنوں میں حق ادائیگی نہیں کرتے ہیں انہیں آزاد صحافی یا فری لانس جرنلسٹ کہا جاتا ہے۔

صحافت ایک ذمہ دارانہ اور محنت طلب پیشہ ہے جس میں ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر سچ کو منکشف کرنے کی دلیرانا اخلاقی جرأت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے ایک آرام بخش و راحت افزا کام سمجھ لینا نادانی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا محنت طلب فن ہے جو صحافی سے پوری سنجیدگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جنبش قلم دینے کا فن تو ظاہر میں آسان نظر آتا ہے مگر حقیقت میں بے حد ریاضت کا متقاضی ہے۔ ہنسی مزاق یا ہلکی پھلکی تفریح کے خاطر صحافت سے ناطہ جوڑنے کا خیال بیوقوفی کے مترادف ہے۔ یہ فن دوسرے پیشوں کی طرح کتابوں میں نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔ اس فن میں مہارت کسی کلاس روم کی چار دیواری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ فن تجربہ کی بھٹی میں جل کر نکھرنے کا نام ہے یہ ایک مسلسل ہنر ہے جس میں آئے دن نئے نئے خیالات، واقعات، حوادث، تجربات اور افکار سے نباہ کرنا پڑتا ہے اس کی پر بات میں ایک نیا سبق مضمون ہوتا ہے۔

میتھو آرنالڈ نامی مشہور انگریزی ادیب نے صحافت کی تعریف یوں کی تھی: ”صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے۔“

جدید صحافی اس تعریف سے متفق نہیں ہیں کیونکہ اس میں ایک طرح سے صحافتی پیشہ کی تذلیل ہے دیکھا جائے تو دونوں کا میدان الگ الگ ہے۔ ادب کے لئے وقت کی کوئی خاص قید مقرر نہیں ہوتی جب کہ صحافت کو ہمیشہ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔

”صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعہ، عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔“

ریاست جموں و کشمیر میں صحافت کا آغاز ۱۹۲۳ء سے ہوتا ہے جب جموں میں لالہ ملک راج صراف نے پہلا ہفت روزہ اخبار ”رنبیر“ جاری کیا۔ اس سے قبل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو کتابوں کی طباعت کے لئے ”بدیا بلاس“ نام کا جو چھاپ

اخبار مانتے تھے۔ محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں ”ریاست میں اُردو کا پہلا اخبار بدیا بلاس ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔ یہ اخبار ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کی پہلی دیاسلانی تھا جس کے مدیر پنڈت گوپی ناتھ گرٹو تھے۔

بدیا بلاس کے ایک سرکاری اخبار کی حیثیت سے شائع ہونے کے باوجود مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ایک ایسے اخبار کی شدت سے محسوس کی جاتی تھی، جو عوامی خواہشات و جذبات کا آئینہ دار ہو۔ چنانچہ کئی اصحابِ فکر و دانش نے متعدد بار مہاراجہ کے دربار میں درخواست دی کہ انہیں ریاست میں اخبار جاری کرنے اور چھاپ خانہ نصب کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ہر بار درخواست مسترد ہوئی۔ نتیجتاً یہ لوگ ریاست سے باہر کے شہروں لاہور، جالندھر، سیالکوٹ، امرتسر، لکھنؤ وغیرہ سے اخبار جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس سلسلے میں پنڈت ہر گوپال خستہ اور ان کے بھائی پنڈت ساک رام کول ساک کی کوششوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں ۱۸۸۲ء میں ساک کا خیر خواہ کشمیر لاہور سے شائع ہوا، ۱۸۸۵ء میں بابو غلام محمد کا ہفتہ روزہ آئینہ ہند لاہور سے اور ۱۹۰۱ء میں منشی محمد دین فوق کا ہفتہ روزہ پنجہ فولاد لاہور، ۱۹۲۴ء خواجہ غلام محی الدین کا ہفتہ روزہ کشمیر امرتسر سے اور مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید ساک کی مشترکہ مساعی سے لاہور سے جاری ہونے والے اخبارات ’مظلوم کشمیری‘، ’مکتوب کشمیر‘، ’کشمیری مسلمان اور ہاتو وغیرہ شامل ہے۔

ریاست سے باہر مختلف شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کسی نہ کسی طرح یہاں تک بھی پہنچتے اور عام لوگوں کے شوقِ خبر بینی کی تسکین کا ذریعہ جاتے تھے۔ اس دور میں بدیا بلاس کے آغاز و اشاعت سے لے کر ۱۹۲۴ء میں رنبیر جاری ہونے تک اگر کسی شخص نے اخبار نکالنے کی کوشش کی تو اس سے بقول رشید تاثیر جائیداد کی ضبطی اور جلا وطنی کی عبرتناک سزا کا موجب قرار دیا گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معدودے چند معمولی درجے کے اخبارات کے سوا جن کا تذکرہ غالباً پہلی بار رشید تاثیر نے اپنی کتاب نقوش صحافت میں کیا ہے۔ ۶۷ برس کی اس طویل مدت میں کوئی قابل ذکر اخبار شائع نہیں ہوا۔ بدیا بلاس کے بعد تحفہ کشمیر کو ریاست کا دوسرا اور وادی کشمیر کا پہلا اخبار قرار دیتے ہوئے تاثیر نے لکھا ہے کہ اس اخبار کو ہفتہ روزہ کی شکل میں منشی کرکھ رائے نے ۱۸۷۶ء میں سرینگر سے شائع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں منشی محمد دین فوق نے مہاراجہ پر تاب سنگھ کو ایک درخواست پیش کی جس میں کشمیر نام سے ایک رسالہ جاری کرنے کی اجازت طلب کی گئی لیکن ڈوگرہ دربار نے بقول فوق نہ صرف اجرائے اخبار کی اجازت دینے سے انکار کیا بلکہ یہ بھی تحریر فرمایا کہ ہم پریس کے معاملہ میں کوئی درخواست سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ۱۹۰۳ء میں لداخ سے پہلا ماہنامہ لداخی نیوز، ۱۹۰۴ء میں لداخ کی زبان کا اخبار لداخی پھونیاں، ۱۹۰۷ء میں جموں سے ماہنامہ ڈوگرہ گزٹ اور ماہنامہ نیقی پتر اور ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ ڈوگرہ سماچار جاری ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں مہاراجہ پر تاب سنگھ نے جموں اینڈ کشمیر سٹیٹ پریس اینڈ پبلی کیشنز ریگولیشن ایکٹ مجریہ ۱۹۱۷ء نافذ کیا جس کی وجہ سے کسی نے اخبار نکالنے کی جرأت نہ کی۔ مئی ۱۹۲۴ء میں کافی تگ و دو کوشش کے بعد لالہ ملک راج صراف کو مہاراجہ کی جانب سے ہفتہ روزہ رنبیر شائع کرنے کی اجازت مل گئی اس طرح مئی ۱۹۲۴ء کو رنبیر کا پہلا شمارہ جموں سے منظر عام برآما۔ جس سے نہ صرف اُردو صحافت کا ماقاعدہ آغاز

ہوا بلکہ بڑی حد تک ایک حقیقی عوامی اخبار کی داغ بیل بھی پڑھ گئی۔ رنبیر کے بعد ریاست میں اخباروں کے اجرا کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ اسے بعد صحافت ایک نئے سنہرے ادوار سے گزر کر آج بھی اپنے فرائض منصبی روزناموں ہفتہ روزوں، ماہناموں، سہ ماہی، شش ماہی کی صورت میں نئے آب و تاب کے ساتھ سرگرم منزل ہے۔ طوالت سے بچتے ہوئے تفصیل سے گزریاں کرتے ہوئے ۱۹۹۲ء تک

ریاست میں شائع ہو رہے اخبارات و جرائد کی تفصیل پیش خدمت ہے۔ صوبہ کشمیر روزنامے ۲۸، ہفتہ روزے ۲۵، ۱۵ روزے ایک

، ماہنامے تین، دو ماہی ایک، صوبہ جموں، روزمانے ۳۱، سہ روزہ ۵۔ ہفتہ روزے ۶، ۱۵ روزے ۶، ماہنامے ۴، دو ماہی ۱۰۔ الغرض جموں اور کشمیر خطوں کے اخبارات و جرائد ریاست میں شائع ہونے والے اخبارات و جرائد کی مجموعی تعداد ۹۷ فیصد ہے۔ آج کی بات کرے تو صحافت ترقی کی منزلوں کو چھو رہی ہے۔ آج شائع ہونے والے اخبارات میں جرائد و رسائل روزناموں، ماہناموں کی تعداد بقیہ زبانوں کے مقابلے میں حوصلہ بخش ہے جو اردو زبان کی ترویج و ترقی میں ایک کلیدی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔

جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ

جاوید احمد نجار

جہاں تک جموں و کشمیر اُردو افسانے کا تعلق ہے یہاں بھی اُردو افسانہ دیگر ریاستوں کے شانہ بہ شانہ آٹھ دہائیوں سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو نثر کے باقاعدہ نمونے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ملتے ہیں۔ جن میں ہر گوپال خستہ کی نثری کتاب ”گلدستہ کشمیر“ کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اُردو زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر ڈوگرہ دور کے مہاراجہ پر تاب سنگھ نے ۱۸۸۹ء کو باضابطہ طور پر سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یوں تو محمد الدین فوق نے سب سے پہلے اُردو افسانے کی طرف توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت کا ”کیلے کا چھلکا“ اور دوسرے افسانے ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوئے لیکن جموں و کشمیر میں اُردو افسانوں کی باضابطہ ابتدا پریم ناتھ افسانوں سے ہوتی ہے۔ وہ ابتداء میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے لیکن ترقی پسند مصنفین انجمن کے قیام اور ان کے مشترکہ افسانوی مجموعے ”انگارے“ کی وجہ سے انہوں نے ادب برائے ادب رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت وغیرہ خیالات کو ترک کر دیا اور ادب کے خارجی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ اُن کی کہانی ”ٹیکہ بٹنی“ اپنی دور کی ایک عظیم کہانی تھی، پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی صحیح عکاسی کی ہے اور کشمیر کو اصل رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں کشمیر کی حقیقی سندرتا نظر آتی ہے۔ انہوں نے کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ”شام و سحر“، ”دنیا ہماری“ اور ”بہتے چراغ“۔ پردیسی کے دوسرے معاصرین میں پریم ناتھ در، تیرتھ کشمیری، ٹھا کر پونچھی، موہن یاور وغیرہ شامل ہیں۔ اُن افسانہ نگاروں کے افسانے فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ای دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن پاروں میں زیادہ تر کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ در کے افسانوں کے دو مجموعے ”کاغذ کا واسدو“ اور ”نیلی آنکھیں“ شائع ہو چکے ہیں۔ تیرتھ کشمیری نے نئے اسالیب اُجاگر کئے ہیں اور موہن یاور نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے نئے نئے گوشے تلاش کئے ہیں اور رومانی اور نفسیاتی پہلو اُجاگر کئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور تقسیم کے ساتھ ہی ہمارے ریاست بھی افراتفری کی شکار ہو گئی جس کی وجہ سے ریاست ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے محرم سے ہو گئی اور یہاں کے ادبی فضا پر بھی اثر پڑا لیکن رفتہ رفتہ حالات سدھر گئے اور یہاں کے ادبی افق پر کچھ نئے چہرے ابھرے جنہوں نے اُردو افسانے کو نئے جہتوں سے آشنا کرایا اُن میں علی محمد لون، شیخ بہادر بھان، حامدی کشمیری، پشکر ناتھ، برج پریمی وغیرہ شامل ہیں۔ حامدی کشمیری کے تین افسانوی مجموعے ”سراب“، ”برف میں آگ“، ”وادی کے پھول“ شائع ہو چکے ہیں اُن میں جدیدیت کی بو ملنے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی گہرائی جنس کا شدید احساس

اُنکے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا عنصر خوب ملتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد نئے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا قافلہ رواں دواں دکھائے دیتا ہے۔ ان کے افسانوی دنیا کے مختلف گوشوں کے مظلوموں کی آہ و فغان کا مشترکہ احساس ملتا ہے۔ ان میں مالک رام آئند، لیش سروج وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ حقیقت اور رومان کا دل نشین سنگم ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد محمد ریاست میں افسانے کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور کئی قلم کار سامنے آئے جن میں محمد زماں آزوردہ، ظہور الدین، ٹھا کر پونچھی، وغیرہ شامل ہیں انہوں نے جہاں علامتی اور تجربے افسانے لکھ کر ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ جدید دور کے افسانہ نگاروں میں آندلہر، غمگین غلام نبی، نظیر نذر، اشوک پٹواری وغیرہ قابل ذکر اضافہ ہیں۔ الغرض ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی ادب میں گذشتہ برسوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

جموں و کشمیر میں اُردو ناول

ڈاکٹر منظور حسین کمار

ریاست جموں کشمیر کا علاقہ صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس ریاست سے ایسے ایسے نامور شعراء ادباء پیدا ہوئے جنہوں نے علم دوستی اور دانش ورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے پورے برصغیر میں اپنا نام پیدا کیا۔ جہاں تک ریاست جموں و کشمیر میں ناول کی بات ہے اس کی روایت اگرچہ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے وہ قابل قدر ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اُردو ناول کے ابتدائی نقوش بیسویں صدی کے شروع میں سالک رام سالک کی تصنیف ”داستان جگت روپ“ اور محمد الدین فوق کی ”انارکلی“ سے ملتے ہیں۔

صوبہ جموں سے ”اخبار ربیر“ کی اشاعت کے ساتھ ہی کئی ناول نگار سامنے آئے جن میں موہن لال مروہ اور وشوانا تھ ورمہ قابل ذکر ہے۔ ۱۹۴۷ء قبل پریم ناتھ پردیسی کا نام خاص طور اہمیت کا حامل ہے۔ پردیسی نے ”پوتی“ اور راما نند ساگر نے ”اور انسان مر گیا“ کے عنوان سے ناول لکھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اس شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی اور نئی نسل کے فن کاروں نے کئی ناول لکھے جو ناول کے مغربی وضع کردہ اصولوں کو ہر اعتبار سے پورا کرتے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کے ناول ”درد کی راکھ“ ”جاتی ہوئی رات“ اور ٹھا کر پونچھی کے ناول ”شع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک“، ”یادوں کے کھنڈر“ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد ناول نگاری کی طرف خاص توجہ ہوئی اور کئی نام ابھر کر سامنے آئے اس دور کے اہم ناول نگاروں میں تیج بہادر بھان خاص اہمیت کے حامل ہے۔ ”سیلاب اور قطرے“ لکھ کر انہوں نے ناول کی تاریخ میں اپنا نام درج کیا۔ بہادر بھان کا یہ ناول ”کشمیر کی درد بھری زندگی“ غریبی اور افلاس اور استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔

غلام رسول سننوش کا ناول ”سمندر پیاسا ہے“ ناول کی تاریخ میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ ”سمندر پیاسا ہے“ ناول میں مصنف نے کسی حد تک ”شعور کی رو“ کی تکنیک کو استعمال کیا ہے۔ علی محمد لون نے ”شاید ہے تیری

آرزو“ لکھ کر دہلا کے مخصوص طبقے کے معاشرے کا بہتر رعبہ عکاسی کیا ہے۔

موجودہ دور میں جن ناول نگاروں نے کئی اہم ناول یادگار چھوڑے ہیں ان میں شبنم قیوم کا ناول ”یہ کس کو لہو کون مرا“ فاروق رینزو ”زخموں کی سالگرہ“ جان محمد آزاد کا ”کشمیر جاگ اٹھا“ حامدی کشمیری کا ”بہاروں میں شعلے“ اور شفق سوپوری نے حال ہی میں ”نیلیما“ کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے جو آدھی واسی عورت پر ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔ اور بقول قدوس جاوید ”یہ ناول اپنے موضوع پر لکھا ہوا اردو ادب کا پہلا ناول ہے۔ اس طرح ناول نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ ان ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے عہد کے کرب کو اپنے ناولوں میں سمیٹا ہے۔ عصر حاضر کا ہمارا ناول نگار اس بات کا شعوری طور پر ادراک رکھتا ہے کہ ناول محض قصہ گوئی کی صنف نہیں ہے بلکہ یہ ناول انسانی زندگی کی خوشیوں اور تلخیوں اور اس کے غموں اور شادمانیوں کی تصویر پیش کرنے کا ایک بے حد موثر وسیلہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے ناول نگاروں نے خاص طور سے نئی نسل کے ناول نگاروں نے صرف عصری سیاست کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس کی روح کے درد کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے جو اض کے انسان کی تقدیر ہے۔ اس میں عصری آگہی کی کتنی ہی پرتیں سامنے آ جاتی ہیں وہ مقامیت سے بھی ماورا ہو گیا ہے۔ ہمارے ناول نگار محض تقلید سے کام نہیں لیتے انہوں نے اسالیب کے کئی رنگ خلق کئے ہیں۔ شروع شروع کے ناول اردو کے بڑے نثر نگاروں اور فکشن لکھنے والوں کے رنگ میں ضرور لکھے گئے لیکن آہستہ آہستہ ہمارے ناول نگاروں نے اپنے راستے تراش لئے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ ناول کی صنف میں ہمارے کارنامے قلیل ہیں اور ان کارناموں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ یہاں کے ناولوں سے حقیقت میں اردو ناول نگاری کا میدان وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

شبلی کی تنقید نگاری

محمد امین نجار

شبلی شاعری کا مقصد پڑھنے اور سننے والے کو مسرت عطا کرنا اور قاری کو انبساط کی دولت عطا کرنا سمجھتے ہیں۔ ادب کو اجاگر کرنے میں شبلی پیش پیش رہے۔ شبلی شاعر، ادیب، ناقد اور محقق ہیں۔ ان کی شخصیت بھی ان کی تنقید میں نظر آتے ہیں۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

”شبلی کی تنقید میں بصیرت کا حسن اور حسن کی بصیرت کا امتزاج بڑی خوبی سے ملتا ہے۔“

حالی کے بعد شبلی ہمارے دوسرے بڑے نقاد ہیں جن کی تنقیدی نظریات نے اپنے زمانے کے ادبی ذوق کو متاثر کیا۔ ان کی تصنیف ”شعر العجم“ کی چھوٹی جلد ہی وہ کتاب ہے جس میں شبلی نے تنقیدی تصورات اور ان کے وضع کردہ اصول واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔ چھوٹی جلد کے ابتدائی حصہ میں خاص طور پر شاعری کی ماہیت، مقصد، اہمیت و افادیت، شاعری سے سماج کا رشتہ، شعر کے لوازمات، شعر کی اثر پذیری اور اس کے علاوہ شعر اور غیر شعر کے امتیازات جیسے مضامین پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ ان کے تصنیف کا مطالعہ کیجئے تو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے خیالات حالی کے خیالات کی ضد ہے۔ یعنی ان کے نزدیک شاعری کا اصل کام اخلاق کو درست کرنا اور زندگی سنوارنا ہے۔ شبلی کے نزدیک شاعری کا مقصد پڑھنے یا سننے والے کو مسرت عطا کرنا ہے۔ ان کی نظر اس حقیقت پر رہتی ہے کہ فن کار نے فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ شبلی جمالیاتی نقاد ہیں۔ ان کے نزدیک شعر و ادب میں حسن کاری ہی اصل شے ہے۔ اس طرح حالی شعر میں معنی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور شبلی لفظ کو، حالی سادگی کے قائل ہیں تو شبلی مینا کاری کے تشبیہ و استعارہ کو شاعری کے لئے وہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔

علامہ شبلی کے نزدیک شاعری دو چیزوں کا نام ہے۔ یہ ہیں محاکات اور تخیل۔ محاکات سے شبلی کی مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گویا محاکات وہ شے ہے جسے ہم تصویر کشی یا آج کی زبان میں شعری پیکر کہتے ہیں۔ محاکات سے زیادہ تخیل کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسے قوت اختراع یعنی نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کو قوت بتاتے ہیں۔ شبلی کے نزدیک شاعرانہ مصوری ہمارے لیے مسرت و انبساط فراہم کرتی ہے۔ شبلی کہتے ہیں:

”کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ وہ شے اچھی ہو یا بُری، اس سے بحث نہیں، مثلاً

چھپکلی ایک بد صورت جانور ہے، اس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک استاد چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال

شبلی شاعری کو تخیل اور محاکات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور تخیل کو محاکات سے بھی زیادہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ تخیل کے بغیر وہ محاکات کو محض نقلی قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں۔ ایک ادراک اور دوسرا احساس اور ان کا کام سوچنا، غور کرنا اور مسائل کو حل کرنا ہے۔ احساس کا کام صرف یہ ہے کہ جب اثر انگیز واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس کہتے ہیں شاعر کا دوسرا نام ہے۔ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

کتابیں:-

شبلی نعمانی	شعر العجم
نور الحسن نقوی	اردو تنقید نگاری
عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقاء

حالی کی تنقید نگاری

محمد امین نجار

اردو میں باقاعدہ جدید تنقید کا آغاز حالی کی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ سے ہوتا ہے۔ جو حالی نے ۱۹۸۳ء میں لکھی۔ یہ اردو کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب ہے جس سے اردو میں تنقید نگاری کی بنیاد پڑی۔ آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کا پہلا منشور (مینی فیسٹو) کہا ہے۔ اس کتاب کا مقصد حالی کے نزدیک معاشرے کی اصلاح تھا۔ اس میں حالی نے شعر و شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ حالی شاعری کو مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے لیے مقصدیت اور افادیت کے قائل تھے۔ شاعری کے تعلق سے حالی کی عمومی رائے یہ ہے کہ سوسائٹی کے لیے شاعری ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ شاعری کے لئے تین شرطوں کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ ہیں تخیل، مطالعہ کا نانا اور تفحص الفاظ۔ تخیل نام ہے خیال کی پرواز کا۔ مطلب یہ کہ شاعر ایک چیز کو دیکھتا ہے اور اس کا خیال دس چیزوں کی طرف جاتا ہے۔ مثلاً پھول میں کبھی اسے خدا کا جلوہ نظر آتا ہے، تو کبھی مجازی محبوب کا پھول کی بکھری ہوئی پتیاں اسے عاشق کے چاکِ غریباں کی یاد دلاتی ہے، کبھی پھول کی مختصر زندگی اسے انسانی زندگی کی بے ثباتی یاد دلاتی ہے۔ حالی کہتے ہیں تخیل کی قوت خدا داد ہے، شاعر اسے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ شاعری کے لئے اتنی ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مشورہ دیتے ہیں کہ شاعر کا تخیل حد سے زیادہ بلند نہ ہونا چاہئے ورنہ قارئین اسے سمجھ نہ پائیں گے۔ شاعر جو کہتا ہے اس کا مواد اسی کائنات حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ انسان اس کائنات کو غور سے دیکھیں اور انسانی زندگی کی کتاب یعنی علم نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو اور تیسری بات یہ کہ شعر کہنے کے دوران تفحص الفاظ یعنی وہ الفاظ کی تلاش پر خاص وجہ دے۔

سادگی، جوش، اصلیت کو حالی شعر کی خوبی ٹھہراتے ہیں۔ حالی کے نزدیک کلام کو سادگی کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو، مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو محاورہ اور روزمرہ کی بول چال کے قریب ہوں۔ سادگی سے حالی کا مطلب یہ ہے کہ آسان خیال آسان لفظوں کے ذریعہ پیش ہو، تاکہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ جوش سے مراد ہے کہ شعر میں بے ساختگی پائی جائے اور یہ ظاہر ہو کہ یہ شعر بے اختیار شاعر کی زبان سے نکلا، نہ کہ کوشش کر کے کہا گیا اور اصلیت سے مراد شاعری میں جتنا ممکن ہو، مبالغے سے گریز کیا جائے یعنی کوئی بات سچائی سے دور نہ ہو۔ یعنی مبالغے میں حد سے نہیں گزرنا چاہیے۔ حالی شعر کے لئے وزن اور قافیے کو وہ ضروری تو نہیں سمجھتے لیکن ان دونوں چیزوں کو شاعری کا زیور بتاتے ہیں۔

”مقدمہ شعر و شاعری“ میں انہوں نے اردو کی چار اہم اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا

ہے۔ مرثیہ انہیں پسند ہے کہ اخلاق کی تعلیم کا یہ بہترین ذریعہ ہے اور مثنونوں کو بھی پسند کرتے ہیں کیوں کہ اس میں مسلسل مضامین بیان کیے جاسکتے ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری کے علاوہ حالی کے تنقیدی نظریات حیات سعدی اور یادگار غالب میں بھی موجود ہیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

”الطاف حسین حالی نے شاعرانہ تنقید کا ایک ایسا الم مرتب کیا جس کا جواب اُردو تو کیا مغرب کی بہت کم زبانوں میں ملے گا۔“

کتابیں:

الطاف حسین حالی	مقدمہ شعر و شاعری
نور الحسن نقوی	اُردو تنقید نگاری
عبادت بریلوی	اُردو تنقید کا ارتقاء